

# سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی

## حضرت علی اکبرؑ کی رخصت و شہادت

اقتباس از تقریر: ذاکر شام غریباں عہدہ العلماء آیت اللہ سید کلب حسین نقوی اختر

اور زمین پر بسنے والے کل کے کل سجدہ کرتے ہیں تو اسی ایک خالق کو جو حق ہے اور جس کا اسم ذات اللہ ہے۔؛ یعنی کافرو مومن، مشرک و منافق کی کوئی تخصیص نہیں۔ عام اس سے کہ کوئی ہو۔ کسی مذہب کا پیرو ہو، کسی راہ کا چلنے والا ہو مگر خوشی سے یا بہ جبر کسی نہ کسی صورت سے خدا ہی کو سجدہ کرتا ہے۔ یہ اتنا گہرا راز ہے کہ جہاں تک ہر انسان کی نظر نہیں جاسکتی۔ مشرک بتوں کو سجدہ کریں اور ہم کہیں خدا کو سجدہ کیا یہ ہماری عقل سے بلند ہے مگر فطرت انسانی کا دیکھنے والا، مزاج انسانی کو لباس وجود پہنانے والا کامل استغنا کے ساتھ ارشاد کرتا ہے کہ سجدہ تم خدا ہی کو کرتے ہو چاہے خوشی سے ہو اور چاہے جبر سے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ جو خوشی سے سجدہ کرتے ہیں ان کو خدا کبھی نہ کبھی سر بلند بھی کرے گا۔ مگر جو بہ جبر سجدہ کرتے ہیں وہ اس کے نزدیک ذلیل و خوار ہی رہیں گے۔ قرآن کا یہ ارشاد بالکل ایسا ہی ہے جیسے آیت کا بیان ”يَسْجُدُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“۔ خدا ہی کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ چیز جو زمین میں ہے یا آسمان میں۔ مَن اور مولا کا فرق جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ آیت پہلی آیت سے بہت زائد عام ہے۔ سجدہ کے بیان میں مَن ہے اور مَن عرف میں ان اشیاء کے لیے آتا ہے جو صاحب عقل و فہم ہوں اور تسبیح کے بیان میں مَن ہے اور مَن جاندار و بے جان سب کے لیے کہا جاتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ تمام عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرتی ہو حالانکہ ہم نے نہ سنی کسی بے جان کی تسبیح۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ یہاں تسبیح تہری

خاص انداز خالقیت و عظمت و جلالت کے ساتھ مالکِ ارض و سماء، مالکِ آب و ہوا، عالمِ باطن و ظاہر قرآن میں ارشاد کرتا ہے کہ ”ہر وہ شخص جو زمین میں ہے یا آسمان میں ہے سجدہ کرتا ہے محض اللہ کے لئے چاہے خوشی سے سجدہ کرے اور چاہے مجبور یوں سے سجدہ کرے۔ اور انہیں پر کیا موقوف ان کے سائے اور پر چھائیاں تک ہر صبح و شام اسی کو سجدہ کرتی ہیں۔“ یہ وہ کلام ہے جس کی لفظیں اپنے حقیقت کے لحاظ سے یہ بتا دینے کو تیار ہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں، خالق انسان کا کلام ہے۔ بندے کا نہیں، معبود کا بیان ہے۔ دل کے بھیدوں سے جاہل نہیں، وہ کہہ رہا ہے جو قلب کی گہرائیوں سے واقف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہر وہ مخلوق جو لباس ملکی پہن کر بزم وجود میں قدسی صفات لے کر آیا سر بسجود ہے۔ صرف ایک اسی اللہ کی بارگاہ میں جس کے علاوہ کوئی الہ برحق نہیں۔ اسی طرح انسانوں میں بھی جو لوگ معرفت کی بلندیوں پر پہنچے وہ بھی اپنے رب ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ مگر ہماری نگاہیں تو ہر وقت دیکھتی ہیں اور بکثرت دیکھتی ہیں کہ انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو کبھی بھول کر بھی خدا کو سجدہ نہیں کرتے۔ بتوں کو سجدے ہر روز کرتے ہیں۔ آفتاب و ماہتاب کے سامنے روز دستِ ادب باندھے سر بسجود ہیں۔ آگ کی پرستش دن رات ہے۔ جانوروں کے سامنے عجز و انکسار ہے۔ مگر نہیں جھکتے تو رب حقیقی کے سامنے اور تمام عمر میں ایک سجدہ بھی نہیں کیا تو صرف الہ برحق کو۔ مگر خدا کا ارشاد ہے کہ، ”آسمان والے سب کے سب

مراد ہے۔ یعنی زبان نہ ہو مگر حالت بتاتی ہے کہ خدا کے موجود ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ اپنی مخلوقیت سے اس کی خالقیت کا اشارہ کر رہے ہیں۔

اپنی احتیاج سے اس کے غنی ہونے کا پتہ دے رہے ہیں اپنے حدوث سے اس کے قدم کی تصدیق کر رہے ہیں۔ اپنے استحکام سے اس کے حکیم ہونے کا اقرار کر رہے ہیں۔ یوں ہی جو خوشی سے سجدہ نہیں کرتے وہ اسکے احکام کی، اس کے تضاد قدر کی اطاعت کر کے سرِ افتیاد جھکا کے سجدہ کر رہے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سجدہ کے ایک معنی ہیں۔ سرِ اطاعت جھکا دینا بعض لوگ اپنی تنگ نگاہی سے صرف پہلے ہی معنوں کی طرف مڑے اور کہہ دیا کہ اگرچہ لفظ عام ہے مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر انسان خدا کو سجدہ کرتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف اسلام کے بندے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ مگر یہ تنگ نگاہی مفہوم حقیقی سے کہیں دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سجدہ سے مراد سرِ اطاعت جھکا دینا ہے اور جب یہ مراد ہے تو ماننا پڑے گا کہ آیت میں ہر مومن و کافر داخل ہے۔ کیوں کہ دنیا کی کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اسکے ارادوں کو روک سکے۔ اس کی مشیت کے سامنے سرتابی کر سکے۔ خدا سے تو انکار لاکھوں نے کر دیا اور کبر و غرور سے بھرا ہوا سر اس کی بارگاہ میں کبھی نہ جھکا یا لیکن اس کا جو حکم آیا اس کے سامنے سرِ اطاعت جھکانا ہی پڑا۔ اگر اس نے پیدا کر دیا تو دنیا میں آنا ہی پڑا۔ اگر دولت دے دی تو خزینہ دار دولت بننا ہی پڑا۔ اگر چادر فقر اڑھائی اس نے تو کسی نہ کسی صورت سے اوڑھنا ہی پڑی۔ اگر مرض دے دیا تو بسترِ علالت آباد ہی کیا۔ اگر اپنی رحمت سے اس نے صحت دے دی تو پھر کار و بار دنیا کرنا ہی پڑا۔ اگر آغوشِ تربیت میں اولاد دے دی تو پرورش کی زحماتیں اٹھانا ہی پڑیں۔ اور اگر یہ نعمت چھین لی تو طوعاً و کرہاً سپرد زمین کرنا ہی پڑا ہے کوئی کافر ہے جو خدا کے ارادے سے سرتابی کر سکا یا انکار کر

سکا؟ جی نہیں کسی ایک کی یہ طاقت نہ ہوئی۔ جھکا یا سر اس کے احکام کے سامنے اور سب نے جھکا یا اور حقیقی سجدہ یہی ہے۔ یاد رکھیں آپ کہ اصل جو کچھ ہے وہ باطن ہے۔ دل ہے۔ نیت ہے۔ اگر باطن نہ ہو تو ظاہر بے اصل ہے۔ اگر دل میں نہیں تو زبان بے حقیقت ہے اگر نیت نہیں تو تمام عبادت بالکل بے کار۔ نماز پڑھے مگر دل میں ایمان نہیں تو قبول نہیں۔ باطن میں نماز کی وقعت نہیں تو کوئی ثواب نہیں۔

حد یہ ہے کہ وہ ایمان ایمان نہیں جو زبان پر ہو اور دل میں نہ ہو۔ تو معلوم ہوا کہ اصل جو کچھ ہے وہ باطن ہے۔ مگر شریعت نے اعتبار کیا ہے ظاہر کا اور اتنا زبردست اعتبار کہ جب تک باطن میں ظاہر شریک نہ ہو عبادت قبول ہی نہیں۔ مثلاً نماز ہو جو بہترین عمل ہے قبول ہو ہی نہیں سکتی جب تک قیام نہ ہو۔ قعود نہ ہو، رکوع نہ ہو، سجود نہ ہو۔ اور وہ صرف اس لیے کہ ظاہر، باطن کی دلیل ہے۔ قیام کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کی فرماں برداری میں جم جانا مگر جس وقت تک انسان نماز میں سیدھا کھڑا نہ ہو قیام کا ظہور نہیں ہوتا۔

رکوع کیا ہے؟ اس کی راہ میں گردن خم کر دینا مگر اس باطن کا ظاہر ہے وہ فعل جس میں گھٹنوں تک ہاتھ پہنچ جائیں۔ یوں ہی سجدہ کیا ہے؟ اس کے ہر حکم کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دینا۔ مگر اس باطن کی تصویر ہے پیشانی خاک پر رکھنا تو یہ کیوں فرمائیے کہ آیت میں ظاہر ہی سجدہ مراد ہے جس میں سر زمین تک پہنچ جائے یہ کیوں نہ کہئے کہ یہاں وہی حقیقی سجدہ مراد ہے جس میں سرِ اطاعت جھکے۔ اور جب یہ معنی مراد لیجئے تو تخصیص کرنے کی ضرورت نہیں۔ مومن و کافر، جن و انس خالق کے اشاروں کے سامنے اس کے پر زور ارادوں کے سامنے جبر سے ہو یا خوشی سے سرِ اطاعت جھکائے نظر آتے ہی ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جس نے ثابت کر دیا کہ کلام اس کا ہے جو ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ باطن پر نظر کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ جن و

انس و ملک سجدہ کرتے ہیں تو خالق ہی کو جس کے ارادے پلٹائے سے نہیں پلٹ سکتے۔ اہی ہم اور آپ کیا ہیں۔ بڑے سے بڑے کافر و مشرک اس کے احکام کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے ہی رہتے ہیں۔ نمبرود نے سر بہت اٹھایا۔ اپنی قوت کے سامنے خلیل خدا کی وقعت نہ سمجھا۔ دولت و سلطنت کو ناکافی سمجھ کر منزل الوہیت کا مدعی ہوا۔ مگر مرض آیا تو سر جھکانا ہی پڑا۔ اور جب ملک الموت کی صورت دیکھ لی تو روح نذر کرنا ہی پڑی۔ اور آج جہنم کے سخت ترین عذاب میں ہے جس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ فرعون نے غرور کی انتہا کر دی۔ اپنی سلطنت بچانے کو ہزاروں بچے قتل کر ڈالے مگر جب اس کی مشیت جاری ہوئی تو خود موسیٰ کو گود میں پرورش کیا۔ اپنے مٹانے والے کو اپنے محل میں رکھ کر پروان چڑھایا۔ اور جب عذاب کا دریا اہل کر آیا تو موجوں کے سامنے سر خم ہی کیا۔ یوں ہی ہر ظالم، ہر غاصب ہر سرکش زبان سے انکار کرتا ہی رہا۔ مگر خالق کے ارادوں کے سامنے کسی ایک کا زور نہ چلا اور سب سرِ اطاعت جھکے رہے۔ اس لیے ارشاد ہے کہ جبر سے ہو یا خوشی سے مگر مجھ کو سجدہ کرنا ہی پڑے گا۔ جب یہ واقعہ ہے کہ کوئی انسان اسکو سجدہ کرنے سے بچ ہی نہیں سکتا تو نا فہمی ہے کہ ہم خوشی سے سجدہ نہ کریں بہ جبر سجدہ کریں۔ جس کا کوئی اجر نہیں۔ کوئی ثواب نہیں۔ پھر کیوں نہ خوشی سے سر جھکائیں کہ سر بلند رہیں۔ اس مقام پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سجدہ اور وہ سجدہ جس کے واسطے خدا کا ارشاد ہے کہ، ”تمام جن و انس، مومن و کافر خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی پیشانیاں اسی کی راہ میں جھکی رہتی ہیں۔“

آیا غیر خالق کے لیے بھی صحیح ہے یا نہیں؟ اگر ہم خدا کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کریں تو درست ہے یا نہیں؟ یہ بحث بڑی مشکل ہے اور یقین حکم دشوار ہے۔ تقسیم کی ہے علماء نے سجدوں کی دو قسموں میں۔ ایک سجدہ عبادت اور دوسرے سجدہ

تعظیمی۔ ان کی صورت میں تو کوئی فرق نہیں مگر تفرقہ صرف نیت میں ہوگا۔ کسی کو معبود سمجھ کر کسی کو مخلوق سمجھ کر محض تعظیم کے خیال سے سجدہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عبادت کی نیت سے خالق کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں ہو سکتا مگر تعظیمی سجدہ ہر اس شخص کے واسطے جائز ہے جو خدا کے نزدیک قابلِ عظمت ہو اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدم کو ملائکہ کا سجدہ سجدہ تعظیمی ہی تھا اور یوسف کو ان کے والد اور بھائیوں کا سجدہ تعظیم ہی کی غرض سے تھا۔ منزلت تھی جناب یوسف کی اور ابھرتی ہوئی منزلت کو بچپن میں خواب میں دیکھا کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اور جب مدت کے بعد باپ سے ملنے کا وقت آیا تو قرآن کی آواز ہے، ”وَحَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا“ اور سب کے سب یوسف کے سامنے سجدے میں گر پڑے اور یوسف کو کہنا پڑا۔

هٰذَا تَاوِیْلُ رُّؤْیَاۤیْ مِنْ قَبْلُ۔ اے میرے پدر بزرگوار یہ میرے پچھلے خواب کی تعبیر ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جب آدم کو ملائکہ نے سجدہ کیا اور یوسف کو خود جناب یعقوب نے سجدہ کیا تو سجدہ تعظیمی غیر خدا کے واسطے بھی جائز ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سجدہ تعظیمی کا بھی غیر خدا کے لیے جائز ہونا مشکل ہے۔ اس لئے یہ کہنا چاہئے کہ سجدہ تو بہر حال صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ البتہ سجدہ کے لیے کبھی کوئی قبلہ معین نہیں بھی ہوتا ہے۔ جیسے اس وقت اگر محض اظہارِ عبدیت کے لیے سر سجدے میں رکھ دیں تو کوئی تخصیص نہیں جس طرف چاہیں پیشانی خم کر دیں۔ یہ وہ سجدہ ہوگا جس کے واسطے قبلہ معین نہیں اور کبھی سجدے کے واسطے قبلہ معین ہوتا ہے جیسے نماز میں کہ جب تک کعبہ کی طرف نہ ہو اس وقت تک سجدہ صحیح نہیں۔ لیکن کبھی یہ قبلہ کوئی جاندار ہوتا ہے اور کبھی بے جان جیسے ہر مسلمان کا سجدہ کعبہ کی طرف جو بے جان ہے اور جیسے ملک کا آدم کو سجدہ جو جاندار تھے یا جناب یعقوب اور ان کے فرزندوں کا سجدہ جناب یوسف کی طرف مگر یاد رکھیے کہ قبلہ بنا کر بھی سجدہ صرف ان ہی چیزوں کی طرف

جائز ہے جن کی طرف پیشانی خم کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے۔  
اس لیے اگر کوئی بتوں کو سجدہ کرے اور محض قبلہ سمجھ کر تو  
بھی جائز نہیں۔ کیوں کہ خدا کا حکم نہیں اور آدمؑ یا کعبہ کو سجدہ  
جائز تھا کیوں کہ حکم اسی کا تھا۔ سر کا جھکاؤ آدمؑ کی طرف تھا مگر  
اطاعت حکم خالق کی تھی۔

اس مقام پر ایک بات اور عرض کر دوں اور وہ یہ کہ کوئی  
اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ جناب یوسفؑ کے کل بھائی متقی نہ  
تھے پر ہیزگار نہ تھے۔ کون ان کو نیک کہہ سکتا ہے جو حاسد  
ہوں۔ کون اُن کو متقی کہہ سکتا ہے۔ جو اپنے باپ سے اور اس  
باپ سے جو نبی ہو جھوٹ بولیں۔ کون ان کو نیک کہہ سکتا ہے جو  
یوسفؑ ایسے بھائی کو بلا خطا تکلیف پہنچائیں، اذیت دیں،  
ماریں اور قتل پر آمادہ ہوں۔ آخر کنویں میں ڈھکیل دیں۔ اور  
جب قافلہ والے جناب یوسفؑ کو کنویں سے نکال لیں تو یہی  
بھائی یوسفؑ کو غلام کہہ کر بیچ ڈالیں؟

ان بھائیوں کو کون نیک کہہ سکتا ہے جو اپنے باپ کو اور  
اس باپ کو جو پیغمبرؑ ہو، چالیس برس اس شدید رنج میں مبتلا  
کریں جس کی آخری حد یہ ہو کہ جناب یعقوبؑ کی بصارت  
جاتی رہے۔ ایسے بھائیوں کو کوئی نیک نہیں کہہ سکتا۔ مگر اس کے  
باوجود جب جناب یوسفؑ نے بچپن میں خواب دیکھا تو ماں  
باپ کی مثال آفتاب و ماہتاب سے دی گئی اور انہیں بھائیوں کو  
ستاروں کی صورت سے پیش کیا گیا۔ جناب یوسفؑ فرماتے  
ہیں۔ ”إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ  
وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ“ بابا میں نے آفتاب و  
ماہتاب اور گیارہ ستاروں کو دیکھا کہ وہ سب کے سب مجھ کو سجدہ  
کر رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ ماں باپ تو شمس و قمر تھے اور ہر  
طرح مبارک و سعید مگر گیارہ ستارے جو بھائی تھے ان میں  
زائد وہ تھے جو بدکردار اور کم وہ تھے جو پرہیزگار۔ تو جب یہ  
معلوم ہو گیا کہ بدکاروں کی مثال بھی ستاروں سے دی جاسکتی

ہے تو اگر بفرض محال پیغمبرؑ فرما بھی دیں کہ ”أَصْحَابِي كَالْجُومِ“ میرے اصحاب ستاروں کی مثل ہیں تو ناز نہ کیجئے۔  
ستارے بن جائیں مگر رہیں گے وہی برادران یوسفؑ جو  
یعقوبؑ و یوسفؑ دونوں کو اذیت دیں البتہ فخر ہے اور ان کے  
لیے جو شمس و قمر بن جائیں۔ بہر حال عرض کرنے کا مقصد یہ تھا  
کہ ملائکہ کے سجدے ہوں آدمؑ کے واسطے یا بھائیوں اور باپ  
کے سجدے ہوں یوسفؑ کے واسطے نہ وہ سجدہ عبادت تھے نہ  
سجدہ تعظیمی تھے بلکہ سجدہ جو کچھ تھا وہ خدا کو تھا۔ صرف رُخ  
سجدوں کا غیر خدا کی طرف تھا۔ جیسے ہمارے سجدے کعبہ کی  
طرف۔ یہی وہ سجدے ہیں جو اقرار عبدیت کے ساتھ ہوں  
خلوص نیت کی آمیزش ہو کمال ایمان کے ساتھ ہوں تو کیا کہنا  
ان سجدوں کا جو چہرے کو ضیاء بار کر دیں۔ پیشانی کا نشان ستارہ  
بن جائے۔ قرآن مدح شروع کر دے۔ ”سَيِّدَاهُمَا فِي  
وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ الشُّجُودِ“ ان کے ایمان کا نشان، ان  
کے جنتی ہونے کی سند ان کی پیشانیوں میں ہے سجدوں کے اثر  
سے۔ اس وقت بد نما ہوں مگر آخرت میں حسین ہوں گے، اس  
وقت سیاہ ہوں مگر محشر میں نورانی ہوں گے۔ آج بُرے معلوم  
ہوں مگر قبر میں ضوفشاں ہوں گے۔ جیسے کعبہ میں حجر اسود، یا  
پتھر کے اندر ہیرا، یا صدف کے پردے میں موتی یا غنچہ کی مٹھی  
میں خوشبو، یا سیاہ بادل میں آفتاب، یا حروف کی سیاہی میں  
قرآن کے معانی۔ یونہی ایمان داروں کی پیشانی پر سجدے کا  
نشان۔ ظاہری صورت میں دل کشی نہیں مگر باطن کو دیکھئے تو  
بہت دل کش۔ مگر یہ تمام دل کش اُس وقت ہے جب خدا کو سجدہ  
ہو اور خوشی سے ہو۔ لیکن اگر خالق حقیقی کا سجدہ نہ ہو غیر کو ہو۔  
بتوں کو ہو یا خدا کو ہو مگر جبر سے ہو تو رو سیاہی ہے کلنک کا ٹیکہ  
ہے۔ جہنم کا پروانہ ہے۔ ہاں ابھی آیت میں ایک بحث اور بھی  
ہے۔ صرف اتنا ہی ارشاد نہیں ہوا کہ تمام انسان تمام جن و  
ملک، مومن و کافر خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ ارشاد ہوتا ہے۔

”فَظْلِهِم بِالْغَدُوِّ دَوْلًا صَالًا“ اور ان کے سائے بھی ہر صبح و شام خدا ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ تفسیر میں آیت کی اختلاف ہے مفسرین کو۔ اس آیت کے معنی سمجھنے میں دشواریاں ہیں۔ انسان کے سائے کا خدا کو سجدہ کرنا غور و فکر کے قابل ہے مگر میرے خیال میں معنی آیت کچھ زائد دشواریاں نہیں۔ کوئی مجسم چیز ایسی نہیں جس کا سایہ نہ پڑے۔ درخت ہیں تو ان کا سایہ، کوہ و جبل ہیں تو ان کا سایہ، حیوان ہے تو اس کا سایہ، انسان ہے تو اس کا سایہ۔ ادھر چاندنی لنگی ادھر سایہ پڑا۔ ادھر آفتاب چکا ادھر سایہ پیدا ہوا، ادھر نور کے سامنے کوئی تاریک چیز آئی ادھر پر چھائیں پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پر چھائیاں بے جان ہیں۔ نافہم ہیں اور عقل و ارادے سے خالی ہیں۔ مگر ان کا طلوع آفتاب و مہتاب کے ساتھ پیدا ہونا اور غروب کے ساتھ ختم ہو جانا۔ آفتاب کی بلندی کے ساتھ ساتھ گھٹنا اور پستی آفتاب کے ساتھ ساتھ بڑھنا اور ہر حالت میں زمین عبودیت پر پھیلنا اور کچھ جانا بتا رہا ہے کہ یہ سائے اسی کی اطاعت میں ہیں جو شمس و قمر کا مالک و خالق ہے اور جس نے آفتاب و مہتاب کو حرکت دے کر سایہ کو مٹایا اور بنایا۔ گویا مطلب باری یہ ہے کہ جاہل اور مغرور انسان ہمارے سامنے سر جھکانا عیب سمجھتا ہے مگر کچھ بھی قدرت ہو تو اپنے سائے کو روک لے منع کر لے۔ جو انتہائی فروتنی کے ساتھ زمین پر بچھا فرماتا ہے۔

ٹھوکریں کھائے یا ہرووں کے زیر قدم آئے مگر جبین نیاز اٹھاتا نہیں۔ اسی انکسار اور اطاعت شعاری کی جزایہ ہے کہ ہم پانی پر قدم رکھیں تو ڈوب جائیں مگر سایہ چادر آب پر کروٹیں بدلتا رہے اور دریا کی بے باک موجیں ہاتھوں پر سنبھال کر ڈوبنے نہ دیں۔ پانی بر سے یا سطح آب پر کروٹیں بدلے مگر سائے کا دامن بھیگتا نہیں۔

آگ پر پڑ جائے تو جلتا نہیں۔ مٹی میں ہو تو گرد آلود نہیں

ہوتا کیچڑ ہو راہ میں تو خراب نہیں ہوتا۔ کثافت ہو کوئی تو نجس نہیں ہوتا۔ کسی کا پیر پڑ جائے تو دبتا نہیں پکلتا نہیں کوئی لاکھ کوشش کرے تو گرفت میں کسی کی آتا ہی نہیں۔ جب اس کی بارگاہ میں خلوص نیت کے ساتھ سر رکھ دیا تو اس نے بھی اتنا سبک کر دیا کہ نہ کسی پر سائے کا بار پڑا۔ اور نہ کسی کے بار سے کوہ گراں بار ہوا۔ ہر عیب سے دامن بچا کر گزرا اور کسی نجاست سے نجس نہ ہوا ہے تو سایہ ہر چیز کا زمین پر مگر مجال ہے کسی کی کہ سایہ پر پیر رکھ دے۔ ہر گز نہیں۔ میرے سائے پر جب کوئی پیر رکھے گا تو سایہ بلند ہو کر پیر کے اور پر آ جائے گا۔ پیر کے نیچے ہر گز نہ رہے گا۔ گویا تعلیم ہے اس کی کہ تم اگر میری بارگاہ میں سر رکھ دو تو پھر دیکھو کہ بلندی کتنی ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ سایہ ہر وقت سائے کی طرح ساتھ رہ کر سر نیاز جھکانے کی تعلیم دے رہا ہے۔ مگر اس تعلیم کی ضرورت اس کو ہے جو سر بلندی کا خیال کرے۔ لیکن جو شخص خود سر نیاز جھکائے ہے اس کو تنبیہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ شاید اسی لیے رسولؐ کے جسم میں سایہ نہ تھا کہ جسم میں تو سایہ ضرور ہوتا ہے مگر سائے میں سایہ ممکن نہیں۔ ہمارے رسولؐ مجسم سایہ رحمت باری تھے لہذا سائے کا سایہ نظر نہ آیا۔ یا یوں عرض کروں کہ خدا نے آپ کو مجسم رحمت بنا دیا تھا۔ ”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ اے رسولؐ تم تمام عالموں کے لیے رحمت ہو اور رحمت جسم و جسمانیات سے بری ہے۔ اور جس میں جسم نہ ہو اس کا سایہ نہیں پڑتا لہذا اگر رسولؐ کا سایہ ہوتا تو رحمت کے حقیقی مصداق نہ ہوتے۔ اور جب سایہ نہ پڑا تو ظاہر ہو گیا کہ رحمت کے مکمل مصداق تھے۔ اور یا یوں عرض کروں کہ سایہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نور کے سامنے ظلمت ہو یا کوئی تاریک چیز ہو۔ لیکن اگر نور کے مقابلے میں نور ہو تو کبھی پر چھائیں پیدا نہ ہوگی۔ لہذا اگر دھوپ میں چلنے کے بعد جسم رسولؐ سے پر چھائیں پیدا ہوتی تو رسولؐ کے نورانی ہونے میں شبہ ہوتا



لیکن جب آفتاب کی روشنی میں راستہ چلے اور جسم رسولؐ نے سایہ نہ دیا تو قول رسولؐ چمک اٹھا۔ ”أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي“ سب سے پہلے خدا نے میرا نور خلق کیا۔ خیال ہو سکتا ہے کہ اول مخلوقات صرف ذاتِ باریکات محمدیؐ ہی تھی۔ اسی لیے رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُورٍ وَاحِدٍ“ میں اور علیؑ دونوں ایک نور سے ہیں اور پھر سیدہ زہراؑ عالم کے واسطے ارشاد ہوا۔ ”فاطمہ میرے دل کا ٹکڑا ہے۔“ پھر امام حسینؑ کے واسطے ارشاد فرمایا ”حُسَيْنٌ مِنِّي وَ أَنَا مِنْ الْحُسَيْنِ“ میں حسینؑ سے ہوں اور حسینؑ مجھ سے ہے۔ اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ آخر میں فرمایا۔ ”أَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَ أَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ“ ہمارا پہلا بھی محمدؐ، ہمارا اوسط بھی محمدؐ، ہمارا آخر بھی محمدؐ۔ ہم سب کے سب محمدؐ۔ تو اب جو کچھ ظلم سیدہؑ پر ہوئے۔ وہ سب محمدؐ پر تھے۔ جو ظلم حسنؑ و حسینؑ پر ہوئے وہ سب محمدؐ پر تھے اور جب امام حسینؑ علی اکبرؑ کے واسطے فرمائیں کہ میرا یہ فرزند صورت میں، سیرت میں، رفتار میں گفتار میں بالکل رسولؐ سے مشابہ ہے تو میں کیوں عرض نہ کروں کہ یزید کے لشکر نے علی اکبرؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ رسولؐ کو شہید کیا۔ اسی لیے اس شاہزادے کی رخصت میں جو عالم امام حسینؑ کا ہوا وہ کسی کی رخصت میں نہیں ہوا۔ پہلے تو یہ میں نے کسی کی کتاب میں نہیں دیکھا کہ امام حسینؑ نے بنی ہاشم میں کسی سے کہا ہو کہ اہل حرم سے رخصت ہو مگر جب جناب علی اکبرؑ نے اجازت میدان طلب کی تو ارشاد فرمایا کہ آخری مرتبہ اہل حرم سے رخصت ہو لو۔ معلوم نہیں امام مظلومؑ نے نورِ نظر کو یہ حکم کیوں دیا؟ ممکن ہے اس لیے فرمایا کہ اولاد پر ماں کا بھی حق ہے لہذا ضروری ہے کہ ماں سے اجازت لے لیں اور زینبؑ نے بھی بڑی محنت سے پالا تھا ان سے اجازت لینا بھی ضروری ہے۔ یا اس لیے کہ آخری مرتبہ اہل حرم شبیہ رسولؑ کی زیارت کر لیں۔ اب دوبارہ یہ چاندی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ میں نے

کہیں نہیں دیکھا کہ جناب علی اکبرؑ نے ماں کو کیوں کر سمجھایا۔ بہن کو گلے لگا کر کیونکر رخصت کیا۔ جس پھوپھی نے اٹھارہ برس محنت و مشقت سے پالا تھا اس پھوپھی سے کیونکر اجازت لی۔ اپنے بھائی سے بھی آخری مرتبہ رخصت ہوئے یا نہیں؟ البتہ حمید ابن مسلمؒ کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ خیمہ کا پردہ اٹھتا تھا اور پھر گرتا تھا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو یہ دیکھا کہ جب علی اکبرؑ چاہتے ہیں کہ خیمہ سے باہر نکلیں تو اہل حرم لپٹ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ سکینہؑ بے چین ہو ہو کے پیروں سے لپٹی ہوگی کہ بھتیاس بے کس بہن کو کس پر چھوڑتے ہو۔ میرے بھائی اب تو چچا عباسؑ بھی نہیں۔ کون میرا خیال کرے گا۔ بہر حال علی اکبرؑ نے سب کو تسلی دی۔ دلاسا دیا۔ سب کو سمجھا بجھا کر خیمہ سے باہر نکلے۔ باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خیال رسائی نہیں کرتا۔ تصورات کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ کسی کی یہ مجال ہی نہیں کہ جب جوان فرزند شبیہ رسولؐ سب کو رخصت کر کے حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوگا اور عرض کی ہوگی۔ بابا! سب سے مل چکا اب آپ بھی اجازت دیں تو باپ کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی؟ مجھ کو تو یقین ہے کہ کوئی اور ہوتا تو سنبھل نہ سکتا اور غش کھا کر گر پڑتا اور دل کی قوت سنبھال بھی لیتا تو بیٹے سے پہلے خود مرنے پر آمادہ ہو جاتا کیوں کہ ہر باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ میں مرجاؤں اور میری اولاد جنازہ اٹھائے۔ مگر حسینؑ سا صابر رضائے الہی میں سر جھکائے ہوئے انبیاء و مرسلینؑ کے صبر کی حدوں سے آگے بڑھ کے جوان فرزند کو میدان شہادت کی اجازت دیتا ہے۔ پہلے تو آسمان کی طرف نظر کر کے فرماتے ہیں۔ بارالہا! تو گواہ رہنا کہ اب وہ جوان مرنے جاتا ہے جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ جب ہم رسولؑ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اس جوان کی صورت دیکھ لیتے تھے۔ اس کے بعد عمر سعدؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد کیا کہ پسر سعد! خدا

تیری نسل کو بھی یونہی قطع کرے جس طرح تو نے میری نسل قطع کی۔ اب علی اکبرؑ نے جوش شجاعت میں گھوڑے کو ایڑ دی۔ اور حسینؑ کیچہ سنبھال کر گھوڑے کے پیچھے چلے۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کر علی اکبرؑ نے پلٹ کر دیکھا کہ ضعیف باپ پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ باگ روک کر عرض کی بابا آپ تو مجھے رخصت کر چکے تھے۔ فرمایا۔ ہاں نور نظر۔ مگر دل نہیں مانتا۔ جب تک تیرا میرا سامنا رہے مڑ کر دیکھتا جا کہ میں تیری صورت دیکھتا رہوں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا کہ جب تک لشکر کی صفوں نے آڑ نہ کر لی ہوگی علی اکبرؑ مڑ کر دیکھتے رہے ہوں گے اور حسینؑ بار بار اپنے لختِ جگر کی صورت دیکھتے رہے ہوں گے۔

مگر جب لشکر کی صفوں نے آڑ کر لی اور جنگ شروع ہو گئی تو اب کہاں موقع تھا کہ علی اکبرؑ مڑ کے دیکھیں اب تو حسینؑ دل سنبھالے ہوئے میدان میں کھڑے تھے اور شبیہ رسولؐ علیؑ کی طرح ہزاروں کے لشکر سے جنگ کر رہا تھا کہ ایک مرتبہ امام حسینؑ کی نگاہ خیمے کی طرف اٹھ گئی۔ دیکھا علی اکبرؑ کی ماں جناب لیلیٰ نظر جمائے ہوئے حسینؑ کے چہرے کو دیکھ رہی ہیں۔ جناب لیلیٰ نے امامؑ کے چہرے پر تغیر دیکھا اور گھبرا کے پوچھا۔ کیوں مولا میرا بچہ تو خیریت سے ہے؟ امام حسینؑ نے شاید یہ چاہا کہ لیلیٰ کو درخیمہ سے ہٹا دیں، اس لیے فرمایا۔ تیرا بچہ تو ابھی تک خیریت سے ہے لیکن ایک بہت بڑا پہلوان مقابلے پر آیا ہے۔ لیلیٰ میرے نانا کی حدیث ہے کہ ”ماں کی دعاء بچے کے حق میں قبول ہوتی ہے۔“ جاؤ لیلیٰ خیمے کے اندر جا کر علی اکبرؑ کے واسطے دعاء کرو۔ میرا دل کہتا ہے کہ ماں نے خیمے کے اندر آ کے سر کے بال کھولے ہوں گے۔ بچوں کو بلایا ہوگا کہ آؤ آؤ۔ میں دعاء کروں۔ تم سب آمین کہو۔ ادھر ماں نے تڑپ تڑپ کر دعاء کی ادھر علی اکبرؑ نے اُس پہلوان کو ایک ہی وار میں فی النار کیا۔ مگر اب دشمن چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ عزاداران حسینؑ! اغیار نے جناب عباسؑ کے جہاد کی

وہ صورت نہیں بیان کی بلکہ امام حسینؑ کے جہاد کی بھی یہ شان نہیں لکھی۔ لیکن علی اکبرؑ کے جہاد کی سب نے تعریف کی ہے۔ شاید اس لیے کہ امامؑ نے فرما دیا تھا کہ علی اکبرؑ رسولؐ کی شبیہ ہیں۔ لہذا علی اکبرؑ نے ثابت کر دیا کہ میرے جد بزرگوار کی شجاعت دیکھنا ہو تو مجھ کو دیکھو۔ تین دن کی پیاس، قیامت کی گرمی، جوانی کا عالم، دشمنوں کی کثرت۔ اس عالم میں بھی ایک سو بیس آدمیوں کو قتل کیا۔ اب پیاس کی شدت ہوئی۔ راستہ روکنے والی فوجوں کو مار کر ہٹا دیا۔ راستہ صاف ہوا تو باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کرتے ہیں کہ زخموں کی کثرت، دھوپ کی شدت، زرہ کی گرانی مارے ڈالتی ہے۔ بابا! اگر تھوڑا پانی مل جائے تو میں دکھا دوں کہ بنی ہاشم کے جوان کیونکر لڑتے ہیں۔ اولاد والو! اب تم ہی بتاؤ۔ ذرا انصاف کرو کہ حسینؑ کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ یقیناً علی اکبرؑ کی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں دل کو براگئی ہوں گی مگر واہ رے صبر اور واہ ری ہمت اور راضی برضائے الہی رہنے کا مظاہرہ کہ اعجاز کی قوت موجود ہونے کے باوجود بیٹے سے ارشاد کرتے ہیں کہ نور نظر پانی تو نہیں ممکن مگر اپنی زبان میرے منہ میں دے دو۔ علی اکبرؑ نے زبان منہ میں دی اور فوراً زبان باہر نکال لی اور عرض کی کہ بابا آپ کی زبان تو میرے سے بھی زیادہ خشک ہے۔

عزاداران حسینؑ! چاہئے تو تھا کہ امام حسینؑ اپنی زبان علی اکبرؑ کے دہن میں دیتے جیسے رسولؐ نے اپنی زبان علیؑ کے دہن میں دی تھی۔ مگر نہیں حسینؑ نے اپنی زبان علی اکبرؑ کے منہ میں نہیں دی بلکہ علی اکبرؑ سے کہا کہ اپنی زبان میرے منہ میں دے دو۔ شاید اس لیے کہ حسینؑ نے بچپن میں سیکڑوں مرتبہ رسولؐ کی زبان چوسی تھی اور علی اکبرؑ شبیہ رسولؐ تھے۔

لہذا چاہا کہ آخری مرتبہ پھر رسولؐ کی زبان منہ میں لے کر تسلیٰ کر لوں۔ یا ممکن ہے کہ حسینؑ کی زبان اتنی خشک تھی کہ منہ سے باہر نہ نکال سکتے تھے۔ بہر حال اب امامؑ نے علی اکبرؑ کو

ایک انگوٹھی دی اور فرمایا کہ نورِ نظر یہ انگوٹھی منہ میں رکھو شاید کچھ تسکین ہو جائے۔ اب تمہارے نانا تم کو آبِ کوثر سے سیراب کریں گے۔ علی اکبرؑ نے انگوٹھی منہ میں رکھی۔ دوبارہ باپ سے رخصت ہوئے۔ میدان میں آئے۔ شدت کی پیاس میں دوبارہ حملہ کیا اور اسی آدمی اور قتل کر دیے۔ آخر میں زخم بڑھنے لگے قوت گھٹنے لگی۔ اس عالم میں ایک نیزہ سینے پر پڑا اور علی اکبرؑ گرنے لگے۔ مگر واہ ری شجاعت، واہ ری بہادری کہ گھوڑے سے گرنا گوارا نہ کیا۔ دونوں باہیں گھوڑے کے گلے میں ڈال دیں۔ دشمن نے مجبور پا کے چاروں طرف سے حملہ کرنا شروع کر دیے یہاں تک کہ روایت میں ہے کہ علی اکبرؑ گولے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ اب علی اکبرؑ زمین پر گرے اور گرتے گرتے آواز دی ’یَا اَبَتَاکَ عَلَیْکَ مِیِّ السَّلَامَ‘ ”بابا! میرا آخری سلام لیجئے۔ بس یہ سننا تھا کہ امام حسینؑ نے دل سنبھالا۔ نورِ نظر کی تلاش میں یا علیؑ یا علیؑ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ممکن ہے کہ علی اکبرؑ ہی کو پکار رہے ہوں۔ کہ نورِ نظر کہاں ہو۔ پھر آواز دو کہ ضعیف باپ سر ہانے پہنچ سکے۔ اور یا جس طرح آپ ہر مصیبت میں علیؑ کو پکارتے ہیں یوں ہی حسینؑ بھی پکار رہے تھے کہ بابا اب تک میں نے صبر کیا۔

(ماخوذ از پندرہ روزہ ارشاد کراچی، سید الشہداء نمبر، ۶/ اپریل ۱۹۶۷ء ص ۱۹ تا ۲۲/)

زیادہ دربارِ شام میں وہ کیا جو اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھا جس کو حسینؑ اور انصارِ حسینؑ نے کربلا کے میدان میں سر کیا۔ مدینہ سے روانگی کے وقت حسینؑ نے غور کیا کہ میری شہادت کے بعد کون ایسا ہے جو میری مظلومی کا اعلانِ ظالم کے تحت حکومت کے نزدیک بیٹھ کر کر سکتا ہے تو حسینؑ نے فیصلہ کر لیا کہ یہ دل و جگر علیؑ کی بڑی بیٹی زینب کبریٰ کا ہے چنانچہ زینبؑ کو حسینؑ اس مصلحت کی خاطر ہمراہ لائے اور آخری وقت اس خدمت کو حسینؑ نے زینب کے سپرد کیا اور حقیقت زینب نے کوفہ کی بازاروں میں شام کے راستوں میں دربارِ ابنِ زیاد میں دربارِ یزید میں مظلوم کی مظلومی اور ظالم کے ظلم کا اعلان فرمایا۔ تاکہ اندھی دنیا پہچان لے کہ یزید باطل پر تھا اور حسینؑ حق پر گامزن۔ مختصر یہ کہ یزید جس کو زمین نینوا پر ظلم و جور کے ساتھ بظاہر فنا کر چکا تھا۔

زینبؑ نے خود اس کے دربار میں مظلوم کا ماتم کیا بس  
یوں سمجھئے کہ یزید نے جس کو مٹایا۔

زینب بنت علیؓ نے اسے زندہ جاوید کر دیا۔  
وہ تھے حسینؓ۔ یہ ہیں زینبؓ جن کے پائے استقلال کو  
بھی یزید کے انتہائی مظالم مقررزل نہ کر سکے۔

(ماخوذ از سفر از لکھنؤ محرم نمبر ۷۶ تا ۱۳۱ھ ص ۷۸ تا ۲۸۱/)

مگر اب مصیبت حد سے آگے بڑھ گئی۔ آپ ہی مدد کیجئے تو دل سنبھلے۔ بہر حال کسی نہ کسی صورت سے ضعیف باپ جوانِ فرزند کی لاش تک پہنچا۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ بیٹے نے آنکھ کھول کے دل سنبھالا۔ عرض کرتے ہیں بابا! سر ہانے نانا کھڑے ہیں۔ دو جامِ کوثر ہاتھوں پر ہیں۔ فرماتے اے علی اکبر! ایک تیرے واسطے ہے اور ایک میرے حسینؑ کے واسطے ہے۔ بس یہ کہتے کہتے ہچکلی آئی اور بیٹے نے آخری مرتبہ باپ کی صورت دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ حسینؑ نے فرمایا ”يَا بَنِيَّ عَلَى الدُّنْيَا بَعْدَكَ الْعَفَى“، بیٹا تیرے بعد جینے کا مزہ نہیں اب اس زندگانی پر خاک ہے۔ اب صبر کی آخری منزل دکھانا تھی۔ ٹوٹی ہوئی کمر سنہالی۔ دل کی قوت سے کام لیا۔ دونوں